ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 501

Program: BS Islamic Studies

Semester: Autumn 2026

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: اصول و آدابِ افتا(501) • سطح: بی ایس علوم اسلامیہ

سمسٹر: خزاں2026

امتحانی مشق نمبر2 (یونٹ5 – 9)

کل نمبر: 100 کامیابی کے نمبر: 50

حل شدہ اسائنمنٹ گائیڈ

(مطالعہ وحوالہ کے لیے)

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعہ اور حوالے کے مقصد کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ کو مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ کورس کے متعلقہ یونٹس کا مطالعہ کرکے جوابات اپنے الفاظ میں تحریر کریں۔

سوال نمبر1: فتویٰ کی تیاری اور اجرا کے مراحل اور تدوین کے اصول(20نمبر)

سوال نمبر1: فتویٰ کی تیاری اور اجرا کے مختلف مراحل بیان کیجیے۔ مسئلے کی درست تفہیم، اور جواب کی تدوین میں کن اصولوں کی رعایت ضروری ہے؟(20نمبر)

تعارف

فتویٰ کوئی فوری ذہنی عمل نہیں بلکہ ایک باقاعدہ علمی عمل ہے جو کئی مراحل سے گزر کر سائل تک پہنچتا ہے۔ جس طرح طبیب پہلے مریض کی مکمل کیفیت سنتا ہے، پھر مرض کی تشخیص کرتا ہے، پھر نسخہ لکھتا ہے، اسی طرح مفتی پہلے واقعے کو سمجھتا ہے، پھر اس کی شرعی حیثیت متعین کرتا ہے، پھر حکم تلاش کرتا ہے اور آخر میں مناسب اسلوب میں جواب تحریر کرتا ہے۔ ابن الصلاح اور ابن القیم جیسے ائمہ نے ان مراحل کو واضح کیا ہے اور اہلِ علم نے فتویٰ کے عمل کو عموماً چار بنیادی مراحل میں تقسیم کیا ہے: تصور المسئلہ،

تکییف المسئلہ، بیان الحکم، اور اصدار الفتویٰ۔ ان مراحل میں کسی ایک کی کمی فتویٰ کو غلط یا نامکمل بنا سکتی ہے۔ اس جواب میں ان مراحل کی تفصیل، مسئلے کی درست تفہیم کی اہمیت اور جواب کی تدوین کے اصول بیان کیے جائیں گے۔

پہلا مرحلہ: استفتا کی وصولی اور ابتدائی جائزہ

عمل کا آغاز استفتا کی وصولی سے ہوتا ہے۔ سوال زبانی بھی آ سکتا ہے اور تحریری بھی؛ جدید دار الافتاؤں میں باقاعدہ نظام کے تحت سوال موصول ہوتا ہے، اس کا اندراج ہوتا ہے اور اسے متعلقہ شعبے یا مفتی کے سپرد کیا جاتا ہے۔ اس مرحلے میں مفتی یہ دیکھتا ہے کہ مسئلہ اس کی صلاحیت و تخصص کے دائرے میں ہے یا کسی اور فن سے متعلق ہے، اور آیا سوال حقیقی واقعے پر مبنی ہے یا محض فرضی ذہنی کھیل؛ اہلِ علم کے آداب میں یہ بات شامل ہے کہ غیر ضروری فرضی مسائل میں وقت ضائع نہ کیا جائے، البتہ تعلیمی مقصد کے فرضی سوالات اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر مسئلہ طبی، معاشی یا تکنیکی پس منظر رکھتا ہو تو اس مرحلے ہی میں اس کے فنی پس منظر کی معلومات حاصل کر لی جاتی ہیں یا بعد کے مرحلے میں ماہرین سے رجوع کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ ابتدائی جانچ پورے عمل کی سمت متعین کرتی ہے اس لیے اسے معمولی نہ سمجھا جائے۔

دوسرا مرحلہ: مسئلے کی درست تفہیم (تصور المسئلہ)

دوسرا اور سب سے نازک مرحلہ مسئلے کی درست تفہیم ہے، جسے اصطلاح میں "تصور المسئلہ" کہتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ "الحکم علی الشیء فرع عن تصورہ"، یعنی کسی چیز پر حکم لگانا اس کے درست تصور کا تابع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں مفتی سائل سے سوال کی مکمل تفصیل لیتا ہے: واقعہ کیا ہے، کب اور کیسے پیش آیا، فریقین کون ہیں، ان کے الفاظ کیا تھے، عرف و علاقے کے حالات کیا ہیں۔ اگر تحریر مبہم ہو تو وضاحتی سوالات کیے جاتے ہیں۔ یہاں مفتی کو اس بات کا خاص اہتمام کرنا ہوتا ہے کہ سائل اکثر اپنا مسئلہ ناقص بیان کرتا ہے یا وہ پہلو چھپا لیتا ہے جو اس کے خلاف جاتا ہو؛ تجربہ کار مفتی جرح نما سوالات سے اصل صورت حال تک پہنچتا ہے۔ قانون و فقہ کا یہ مسلمہ اصول ہے کہ صورتِ واقعہ بدل جائے تو حکم بدل جاتا ہے، لہٰذا اس مرحلے کی غلطی ساری محنت کو رائیگاں کر دیتی ہے۔ فقہا کے مشہور واقعات میں اسی لیے ملتا ہے کہ صحابہ و ائمہ پہلے واقعہ پوری طرح سنتے، پھر جواب دیتے۔

تیسرا مرحلہ: تکییفِ فقہی

واقعہ واضح ہو جانے کے بعد تیسرا مرحلہ "تکییف" ہے، یعنی پیش آمدہ صورت کو فقہ کی کسی معین قسم و باب میں رکھنا۔ مثلاً کوئی مالی معاملہ دیکھ کر یہ متعین کرنا کہ یہ بیع ہے یا اجارہ، قرض ہے یا مضاربہ، اور درست ہے یا فاسد؛ کسی عبارت کو سن کر یہ قائم کرنا کہ یہ صریح طلاق ہے یا کنایہ۔ تکییف درست ہو تو حکم کا راستہ خود بخود کھلتا ہے، اور تکییف غلط ہو تو مفتی درست کتاب کھول کر بھی غلط مسئلہ نکال لیتا ہے۔ جدید مسائل میں یہ مرحلہ سب سے زیادہ ذہانت طلب ہے: مثلاً برقی کرنسی، انشورنس کی اقسام، مصنوعی تولید یا ڈیجیٹل معاہدوں کو پہلے ان کی حقیقت کے اعتبار سے فقہی زمروں میں رکھا جاتا ہے، تب حکم کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ اس مرحلے میں ماہرینِ فن سے مشاورت، جسے "تحقیق المناط" کی تیاری کہا جا سکتا ہے، ناگزیر ہوتی ہے۔

چوتھا مرحلہ: ادلہ و مصادر کی مراجعت اور ترجیح

چوتھے مرحلے میں مفتی حکم کی تلاش میں مصادر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ ترتیب یہ ہوتی ہے کہ پہلے قرآن و سنت میں حکم تلاش کیا جاتا ہے، پھر اجماع کی صورت حال دیکھی جاتی ہے، اور مذہبی مفتی اپنے مذہب کے معتمد متون و شروح اور کتبِ فتاویٰ کی مراجعت کرتا ہے۔ اس مرحلے کے تقاضے یہ ہیں: (1) مسئلے کی اصل کتاب سے مراجعت کی جائے، سنی سنائی بات پر اعتماد نہ ہو؛ (2) اختلافی مسئلہ ہو تو اقوال کا پورا نقشہ ذہن میں ہو اور قولِ معتمد و مفتیٰ بہا کی شناخت ہو؛ (3) اگر مسئلہ جدید ہو تو قیاس و مقاصد اور سابقہ نظائر پر غور کیا جائے اور اکیڈمیوں کی قرارات سے استفادہ ہو؛ (4) مشکل مسئلے میں اہلِ علم سے مشورہ کیا جائے، کیونکہ اجتماعی غور غلطی کے امکانات گھٹاتا ہے۔ اس مرحلے میں جلدی سب سے بڑی دشمن ہے؛ سلف کے بارے میں منقول ہے کہ بڑے مسائل پر وہ دنوں اور مہینوں غور کرتے تھے۔

پانچواں مرحلہ: جواب کی تدوین

حکم متعین ہو جانے کے بعد پانچواں مرحلہ اسے تحریر کی صورت دینا ہے۔ یہ مرحلہ جتنا سادہ دکھائی دیتا ہے اتنا ہی اہم ہے، کیونکہ اکثر بدنامی غلط تدوین سے ہوتی ہے، غلط فہم سے نہیں۔ تدوین کے اصول درج ذیل ہیں:

- ابتدا حمد و تعوذ یا روایتی آداب سے ہو اور جواب کی نسبت اللہ کی توفیق کی طرف رہے؛ سلف فتویٰ کے آغاز میں "وباللہ التوفیق" لکھنے کا اہتمام کرتے تھے۔

- مسئلے کی صورت مختصر مگر جامع انداز میں درج ہو تاکہ پڑھنے والا جان لے کہ جواب کس صورت پر ہے؛ اس سے فتویٰ کا غلط اطلاق رک جاتا ہے۔
- جواب واضح، دو حرفی اور فیصلہ کن ہو؛ گول مول عبارت جس سے سائل اصل حکم تک نہ پہنچے، تدوین کی ناکامی ہے۔ جہاں احتیاط لازم ہو وہاں اس کی صراحت ہو۔
- زبان سائل کے فہم کے مطابق ہو؛ عربی اصطلاحات بلا ضرورت نہ بھری جائیں، اور جہاں دلیل ذکر کرنا مناسب ہو وہاں اصل و حوالہ درج ہو۔
- فتویٰ میں سائل کی تحقیر، طنز یا اخلاقی خطبہ نہ ہو؛ نرمی و ہمدردی تزکیاتی اسلوبِ دعوت کا تقاضا ہے۔
- آخر میں مفتی کے دستخط و مہر اور ادارے کی تفصیل درج ہو تاکہ جواب ذمہ دار اور قابلِ شناخت ہو۔

چھٹا مرحلہ: اجرا، ترسیل اور ریکارڈ

تدوین کے بعد آخری مرحلہ فتویٰ کے اجرا کا ہے، یعنی اسے سائل تک پہنچانا اور اپنے پاس اس کا ریکارڈ محفوظ رکھنا۔ منظم دارالافتاؤں میں ہر فتویٰ کو نمبر الاٹ ہوتا ہے، استفتاء جواب کی نقل دفتر میں محفوظ رہتی ہے، اور بعض صورتوں میں ترسیل سے پہلے جواب کی نظر ثانی کسی دوسرے مفتی سے بھی کرائی جاتی ہے۔ اجرا میں دو باتوں کی رعایت ضروری ہے: ایک یہ کہ فتویٰ صرف سائل یا اس کے وکیل کو دیا جائے اور نجی مسائل میں رازداری برقرار رہے؛ دوسرے یہ کہ اگر سائل بعد میں مزید وضاحت چاہے یا صورتِ واقعہ میں کوئی تبدیلی نکل آئے تو نظر ثانی کا دروازہ کھلا رہے، کیونکہ صورت بدلنے سے فتویٰ کا اطلاق بدل جاتا ہے۔ فتویٰ کا ریکارڈ محفوظ ہونا ادارے کے لیے بھی ضروری ہے کہ کہیں اس کا نام لے کر کوئی من گھڑت بات نہ پھیلائی جائے، اور علمی تاریخ کے لیے بھی کہ یہ فتاویٰ بعد میں طبع ہو کر امت کے علمی سرمایے کا حصہ بنتے ہیں۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فتویٰ چھ باقاعدہ مراحل کا عمل ہے: استفتا کی وصولی و جائزہ، مسئلے کی درست تفہیم، اس کی تکییفِ فقہی، ادلہ و مصادر کی مراجعت و ترجیح، اصولوں کے مطابق جواب کی تدوین، اور آخر میں ذمہ داری کے ساتھ اس کا اجرا و ریکارڈ۔ ان میں تفہیمِ مسئلہ بنیاد ہے، تکییف اس کی کنجی ہے اور تدوین اس کا چہرہ۔ جس فتویٰ کے یہ مراحل پختہ ہوں وہ غلطی سے قریب تر نہیں، صحیح سمت میں امت کی رہنمائی کرتا ہے؛ اور جس میں عجلت و اہمال داخل ہو وہ فتویٰ خود فتنے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدارس میں افتا کی تربیت (اسپیشلائزیشن) کو مستقل شعبہ بنایا گیا ہے تاکہ طالب علم علم کے ساتھ ساتھ یہ عملی مراحل بھی مشق کر کے سیکھے۔

سوال نمبر 2: فقہا و مفتیان کے طبقات و مراتب: علمی ضرورت اور عملی اثرات (20 نمبر)

سوال نمبر 2: فقہا اور مفتیان کے طبقات و مراتب کی تقسیم کس علمی ضرورت کے تحت کی گئی؟ مختلف فقہی مکاتب کے مناہج کی روشنی میں اس تقسیم کے عملی اثرات واضح کیجیے۔

(20 نمبر)

تعارف

فقہ اسلامی کی تیرہ سو سالہ تاریخ میں ہزاروں فقہا و مفتیان گزرے ہیں، مگر سب کا علمی مرتبہ ایک جیسا نہیں۔ کوئی خود اصول وضع کر کے احکام مستنبط کرتا ہے، کوئی اپنے مسلک کے اصولوں کے اندر اجتہاد کرتا ہے، کوئی روایات میں ترجیح دیتا ہے اور کوئی محض نقل و تدریس کرتا ہے۔ ان متفاوت مراتب کو پہچاننے اور باقاعدہ طبقات میں تقسیم کرنے کا کام "علم طبقات الفقہاء" کہلاتا ہے۔ حنفی مکتب میں اس تقسیم کو سب سے زیادہ باقاعدہ صورت ابن کمال پاشا (متوفی 940ھ) نے دی، جبکہ شافعی مکتب میں تاج الدین سبکی کی "طبقات الشافعیۃ الکبریٰ" اور دیگر مکاتب کی طبقات کی کتابیں اسی ضرورت کی تکمیل ہیں۔ اس جواب میں پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ یہ تقسیم کس علمی ضرورت کے تحت کی گئی، پھر بڑی تقسیمات کا تعارف اور آخر میں اس کے عملی اثرات کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

تقسیم کی علمی ضرورت

طبقات کی تقسیم کے پس پردہ کئی علمی ضرورتیں کارفرما تھیں۔ پہلی ضرورت مذہب کی حفاظت و ضبط ہے: جب کسی مسلک میں سینکڑوں اقوال و روایات موجود ہوں تو یہ بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ کس کا قول کس درجے پر معتبر ہے، تاکہ ہر کس کا قول دلیل بنا کر مذہب کا نظام درہم برہم نہ ہو۔ دوسری ضرورت ترجیح کا معیار ہے: روایات متعارض ہوں تو مفتی کو یہ جاننا ہوتا ہے کہ کس فقیہ کے اختیار کردہ قول کو ترجیح دی جائے؛ ظاہر ہے مجتہدِ مطلق کا قول مقلد کی رائے پر مقدم ہو گا۔ تیسری ضرورت تدریس و تربیت کی ہے: طالب علم کو یہ سمجھانا کہ کون سی کتاب کس درجے کی ہے اور کس عالم سے کس قسم کے مسئلے میں رجوع کیا جائے، طبقات ہی کی معرفت سے ممکن ہے۔ چوتھی ضرورت تاریخی و تنقیدی ہے: ہر دور کے مسائل و رجحانات سمجھنے کے لیے فقہا کو ان کے ادوار و مراتب میں رکھ کر پڑھنا ہوتا ہے۔ پانچویں ضرورت علمی امانت ہے: کسی قول کی نسبت اس کے کہنے والے کے درست مرتبے کے ساتھ ہو تو سائل و قاری دھوکے میں نہیں پڑتا۔ انہی ضرورتوں نے علما کو اس تقسیم پر آمادہ کیا۔

حنفی مکتب کی مشہور تقسیم: سات طبقات

ابن کمال پاشا نے فقہائے حنفیہ کو سات طبقات میں تقسیم کیا، جسے بعد میں ابن عابدین نے "شرح عقود رسم المفتی" میں نقل کر کے معیار بنایا۔ یہ طبقات درج ذیل جدول میں خلاصہ کیے جاتے ہیں:

جدول 1: فقہا کے طبقات (ابن کمال پاشا کی تقسیم)

طبقہ	نام و وصف	نمایاں مثال
پہلا	مجتہد ان فی الشرع: اصول و قواعد وضع کرنے والے ائمہ	امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد
دوسرا	مجتہد ان فی المذہب: مسلک کے اصولوں کے اندر اجتہاد کرنے والے	امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر
تیسرا	مجتہد ان فی المسائل: جن مسائل میں کوئی نص نہیں، ان میں اجتہاد کرنے والے	خصاف، طحاوی، کرخی، حلاوائی، سرخسی
چوتھا	اصحابِ تقلید: روایات میں ظاہر کو غیر ظاہر پر ترجیح دینے والے اہلِ ترجیح	رازی (جصاص) وغیرہ
پانچواں	اہلِ ترجیح: اقوال میں قوت و ضعف کے اعتبار سے ترجیح دینے والے	قدوری، صاحبِ ہدایہ (مرغینانی)
چھٹا	اہلِ تمییز: قوی و ضعیف اور ظاہر الروایہ و نادر کی تمییز رکھنے والے	کنز، مختار، وقایہ و مجمع کے مصنفین
ساتواں	مقلدین: محض نقل کرنے والے، ترجیح و تمییز سے عاجز	بعد کے ناقلین و مدرسین

اس جدول سے واضح ہوتا ہے کہ تقسیم کی روح مراتبِ علم کی تدریج ہے: جتنا بلند طبقہ اتنی ہی زیادہ استنباطی اہلیت، اور جتنا نیچا طبقہ اتنا ہی زیادہ نقل پر انحصار۔ مفتی کے لیے یہ جاننا ضروری قرار دیا گیا کہ وہ خود جس مرتبے پر ہے اسی حد کے اندر کام کرے؛ مقلد کے درجے کے عالم کا کام اجتہاد نہیں بلکہ معتمد نقل ہے۔

دیگر مکاتب کے مناہج طبقات

شافعی مکتب میں طبقات کی تقسیم سب سے زیادہ مرتب ادب رکھتی ہے: ابن الصلاح، نووی، ابن السبکی اور اسنوی نے باقاعدہ کتابیں لکھیں۔ ان کے ہاں طبقات کی بنیاد زیادہ تر زمانی تسلسل اور استاد و شاگرد کے سلسلے پر ہے؛ ہر نسل کو ایک طبقہ قرار دے کر ان کے فقہی رجحانات و اثرات بیان کیے گئے۔ اس کے ساتھ شافعیوں نے مرتبے کی ایک اور تقسیم بھی رکھی: مجتہدِ مطلق، مجتہدِ منتسب، مجتہد فی المذہب اور مذہب پر نقل و تفہم۔ مالکی مکتب میں قاضی عیاض کی "ترتیب المدارک" اور ابن فرحون کی "الدیباج المذہب" نے یہی خدمت انجام دی؛ وہاں مکتب کے داخلی مراکز (مدینہ، عراق، قیروان، اندلس) کو بھی تقسیم میں شامل کیا گیا۔ حنبلی مکتب میں ابن ابی یعلیٰ کی "طبقات الحنابلۃ" اور ابن رجب کی ذیل اس پر اسی نہج کی مثالیں ہیں۔ تقابلی نظر سے حنفی تقسیم مراتب "واماہیت" کی بنیاد پر زیادہ علمی و تکنیکی ہے، جبکہ شافعی و حنبلی تقسیمات "زمانی سلسلے و تراجم" کی بنیاد پر زیادہ تاریخی ہیں؛ البتہ مقصد سب کا ایک ہے: اقوال کے وزن کا تعین اور مکتب کی روایت کا تسلسل محفوظ رکھنا۔

تقسیم کے عملی اثرات

اس تقسیم کے عملی اثرات افتا، قضا اور تدریس تینوں میدانوں میں گہرے ہوئے۔ افتا میں سب سے بڑا اثر یہ ہوا کہ مفتی کے لیے اپنے مرتبے کی حدود طے ہو گئیں: مقلد مفتی نصوصِ مذہب سے باہر قدم نہیں اٹھا سکتا، اور اسے کتاب کے اس قول پر فتویٰ دینا ہوتا ہے جسے اہلِ ترجیح نے معتمد قرار دیا ہو؛ یوں فتویٰ ذاتی رائے کے بجائے نظام کا حصہ بن گیا۔ قضا میں اثر یہ ہوا کہ قاضی کے لیے بھی طبقاتی نظم معیار بنا: اقضیٰ کے منصب پر فائز شخص سے متوقع علم کا درجہ مقرر ہوا اور عدالتی فیصلوں میں اقوال کی ترجیح کا یہی نقشہ استعمال ہوا۔ تدریس میں اثر یہ ہوا کہ نصابی کتابیں اسی درجہ بندی کے مطابق چنی جانے لگیں کہ کون سی کتاب متون کے درجے کی ہے، کون سی شروح کی اور کون سی فتاویٰ کی۔ ایک اور اہم اثر یہ ہوا کہ اختلافی مسائل میں "قول مفتی بہا" کی شناخت ممکن ہوئی، کیونکہ معلوم ہو گیا کہ ترجیح کا اختیار کن طبقات کو حاصل ہے اور ان کے اختیار کردہ اقوال کون سے ہیں۔

تاہم تنقیدی نظر سے اس تقسیم کے بعض منفی اثرات بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ ایک یہ کہ درجہ بندی نے بعد کے ادوار میں تحقیق کے جذبے کو کمزور کیا اور "بابُ الاجتہاد" کے بند ہونے کے تصور کو تقویت دی، کیونکہ جب نیچے کے طبقات کو اجتہاد سے روک دیا گیا تو بہت سے اہلِ علم نقل و تلخیص میں مشغول رہ گئے۔ دوسرا نقصان یہ ہوا کہ بعض جگہ

طبقات کی حدود کو ضرورت سے زیادہ تقدیس دی گئی اور سلف کے اقوال کا جائزہ دلیل کی بنیاد پر کم اور رتبے کی بنیاد پر زیادہ ہونے لگا۔ پھر بھی انصاف یہی ہے کہ یہ خامیاں تقسیم کے اصل مقصد کی نہیں بلکہ اس کے مبالغہ آمیز استعمال کی ہیں؛ اصل تقسیم نے امت کے علمی نظام کو وہ ضبط عطا کیا جس کے بغیر مذاہب کا سرمایہ منتشر ہو جاتا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ فقہا و مفتیان کے طبقات کی تقسیم کسی طبقاتی تعصب کا نتیجہ نہیں بلکہ خالص علمی ضرورتوں، یعنی ضبطِ مذہب، ترجیح کے معیار، تدریس کی تنظیم اور امانتِ نسبت کی تکمیل ہے۔ حنفی مکتب نے اسے اہلیت و مرتبے کی بنیاد پر سات طبقات میں مرتب کیا، جبکہ دیگر مکاتب نے اسے زمانی و تاریخی تسلسل کے ساتھ بھی آگے بڑھایا۔ اس کے عملی اثرات سے افتا منضبط ہوا، قضا کو معیار ملا اور تدریس کو سمت ملی؛ اور اس کا سبق آج بھی یہی ہے کہ ہر مفتی اپنی علمی حدود پہچان کر اسی دائرے میں کام کرے۔ یہی خود شناسی اصولِ افتا کی بنیادی شرائط میں سے ہے۔

سوال نمبر 3: مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ: ساخت، موضوعاتی وسعت اور فقہی منہج (20 نمبر)

سوال نمبر 3: مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ کی ساخت، موضوعاتی وسعت اور فقہی منہج کا تعارف پیش کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

فتاویٰ کی تاریخ میں "مجموع الفتاویٰ" یا "مجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ" ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ یہ کسی دار الافتا کا جاری کردہ رسمی مجموعہ نہیں بلکہ آٹھویں صدی ہجری کے عظیم محقق، شیخ الاسلام تقی الدین احمد بن عبد الحلیم ابن تیمیہ (661ھ – 728ھ) کے فتاویٰ، رسائل اور علمی مکاتیب کا وسیع ذخیرہ ہے جسے ان کی وفات کے صدیوں بعد جمع کر کے مرتب صورت میں شائع کیا گیا۔ یہ مجموعہ 37 جلدوں پر مشتمل ہے اور محض فقہی مسائل تک محدود نہیں بلکہ عقائد، تفسیر، حدیث، اصول اور تصوف سمیت دینی علوم کا ایک بحرِ بے کنار ہے۔ اس جواب میں مصنف کا مختصر تعارف، مجموعے کی ساخت و تدوین، موضوعاتی وسعت اور ان کے فقہی منہج کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

ابن تیمیہ کا مختصر تعارف

احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام ابن تیمیہ حران میں 661ھ میں پیدا ہوئے اور دمشق میں پروان چڑھے۔ حنبلی مکتب میں پرورش پائی مگر ان کا علمی مزاج کسی ایک مکتب کی تقلید میں قید ہونے کے بجائے دلیل کی تلاش میں رہا۔ قرآن و حدیث پر غیر معمولی عبور، فقہی مذاہب کے اختلافات پر گہری نظر، منطق و فلسفے کی تنقید اور جہاد و اصلاح میں عملی شرکت ان کی شخصیت کے نمایاں پہلو ہیں۔ انہوں نے اپنے دور کے اہم مسائل، خواہ وہ عقائد کے انحرافات ہوں، اہلِ بدعت کے شبہات، سیاسی و سماجی بحران، یا عام لوگوں کے فقہی مسائل، سب پر قلم اٹھایا اور فتویٰ دیا۔ قید و بند کی صعوبتیں بھی جھیلیں اور 728ھ میں قلعہ دمشق کی قید ہی میں وفات پائی۔ ان کی تصانیف و فتاویٰ کی تعداد سینکڑوں میں ہے، جن میں منہاج السنہ، درء تعارض العقل والنقل، اقتضاء الصراط المستقیم اور السیاسۃ الشرعیہ خاص طور پر مشہور ہیں۔

مجموعے کی ساخت و تدوین

ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ کو خود "مجموع" کی صورت میں مرتب نہیں کیا تھا؛ ان کے فتاویٰ رسائل، خطوط اور کتابوں کی صورت میں بکھرے ہوئے تھے۔ موجودہ مجموعہ بیسویں صدی عیسوی میں شیخ عبد الرحمن بن محمد بن قاسم اور ان کے فرزند محمد بن عبد الرحمن بن قاسم کی محنت سے مرتب ہوا اور سعودی عرب کے فرمانروا کی سرپرستی میں ریاض سے 37 جلدوں میں شائع ہوا۔ تدوین میں ایک موضوعاتی ترتیب اختیار کی گئی ہے: ابتدائی جلدیں عقائد و توحید، ایمان، قضا و قدر اور فرق و مذاہب کے رد پر ہیں؛ پھر علم، تفسیر، حدیث اور اصولِ فقہ کے مباحث؛ اس کے بعد تصوف و اخلاق و سلوک کے مسائل؛ اور مجموعے کا بڑا حصہ خالص فقہ پر ہے جو کتاب الطہارۃ سے شروع ہو کر عبادات، معاملات، نکاح و طلاق، جنایات و حدود، جہاد، سیاستِ شرعیہ اور فرائض تک فقہ کے روایتی ابواب کی ترتیب سے چلتا ہے۔ ہر موضوع کے تحت فتاویٰ کے ساتھ وہ رسائل بھی رکھ دیے گئے ہیں جو ابن تیمیہ نے اسی مسئلے پر مستقل تصنیف کیے تھے، اس لیے یہ مجموعہ ان کے مکمل علمی سرمائے کا قریب قریب جامع نقشہ بن گیا ہے۔ آخر میں فہارس و اشاریے دیے گئے ہیں جن سے ہزاروں مسائل تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔

موضوعاتی وسعت

اس مجموعے کی وسعت اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ فقہی اعتبار سے کوئی باب ایسا نہیں جس پر ابن تیمیہ کے فتاویٰ و تحقیقات موجود نہ ہوں: عبادات کے دقیق مسائل، خرید و فروخت و شرکت کی صورتیں، وقف، وصیت، نکاح و طلاق کے اختلافی مسائل، اور جہاد و سیاست جیسے موضوعات پر مفصل کلام موجود ہے۔ مگر یہ مجموعہ خالص فقہ سے

آگے بڑھ کر عقائد کی اصلاح، باطل فرقوں کی تردید، اہلِ تصوف کی غالی روش پر نقد، منطقی و فلسفیانہ شبہات کے جوابات، تفسیر و حدیث کے چنیدہ مباحث، اور شریعت کے مقاصد و مصالح کی بحث بھی سموئے ہوئے ہے۔ اسی وسعت کی بنا پر اس کتاب کو "انسائیکلوپیڈیا" کی حیثیت حاصل ہے؛ محقق کسی بھی بڑے دینی مسئلے پر تحقیق شروع کرے تو ابن تیمیہ کی رائے و دلیل تک رسائی اس مجموعے سے حاصل کر لیتا ہے۔ نیز یہ مجموعہ خطوط، سوالات کے جوابات اور عملی فتاویٰ کا بھی خزانہ ہے جس سے ان کے دور کے معاشرے کی دینی و سماجی تصویر بھی ابھرتی ہے۔

فقہی منہج

ابن تیمیہ کے فقہی منہج کی نمایاں خصوصیات درج ذیل ہیں:

- کتاب و سنت کی طرف براہِ راست رجوع: ان کے نزدیک اصل ماخذ وحی ہے؛ کسی امام کا قول دلیل کے مقابلے میں حجت نہیں۔
- سلف صالحین کی فہم کی ترجیح: نصوص کی وہی تفسیر معتبر ہے جو صحابہ و تابعین اور ائمہ سلف سے ثابت ہو۔
- ترجیح بالدلیل: چاروں ائمہ اور دیگر مجتہدین کے اقوال میں سے جس کی دلیل قوی ہو اسے اختیار کرنا، خواہ وہ ان کے اپنے حنبلی مکتب کے مشہور قول کے خلاف ہو؛ طلاق کے بعض مسائل اور حج وغیرہ میں ان کے مشہور اختیارات اسی اصول کے نمونے ہیں۔
- اجماع کی قدر و پابندی: قطعی اجماع کی مخالفت ان کے نزدیک جائز نہیں، البتہ وہ ہر دعوائے اجماع کو تحقیق سے پرکھتے ہیں۔
- اختلاف میں وسعت: جس مسئلے میں سلف کا اختلاف ثابت ہو اس میں وہ تنگی پیدا کرنے اور عوام کو ایک ہی قول پر مجبور کرنے کے قائل نہیں۔
- مقاصد و مصالح کی رعایت: حکم کی علت و حکمت ملحوظ رکھنا، سد ذرائع اور عرف کی رعایت ان کے فتاویٰ میں نمایاں ہے۔

ان کے منہج پر ایک تنقیدی نکتہ بھی اہلِ علم کے ہاں بیان ہوتا ہے کہ انہوں نے بعض مسائل میں جمہور کے مشہور اقوال سے اختلاف کیا، جس پر ان کے ہم عصر اور بعد کے علما نے رد و قبول دونوں طرح کے ردِ عمل ظاہر کیے۔ مگر یہ حقیقت مسلم ہے کہ ان کا اختلاف ہمیشہ دلیل کی زبان میں ہوتا ہے، اور ان کی یہی دلیل پرستی و تحقیقی جرات بعد کے اہلِ

علم کے لیے تحقیق کے دروازے کھولنے کا سبب بنی۔ امام ابن القیم اسی مکتب کے سب سے بڑے نمائندے ہیں جنہوں نے اپنے استاد کے منہج کو "اعلام الموقعین" اور "زاد المعاد" میں مزید نکھارا۔

علمی مقام واثرات

مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ کا شمار عالم اسلام کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے علمی ذخائر میں ہوتا ہے۔ سلفی و حنبلی حلقوں میں یہ بنیادی ماخذ ہے ہی، مگر اس کی تحقیقات سے تمام مکاتب کے محققین استفادہ کرتے ہیں۔ اس کی پرنٹ و ڈیجیٹل اشاعتیں کثرت سے ہو چکی ہیں اور اس کے حصوں کے تراجم و تلاخیص بھی شائع ہوئی ہیں۔ افتا کے طالب علم کے لیے اس مجموعے کی اہمیت دوگنی ہے: ایک یہ کہ اس سے "محقق مفتی" کا عملی نمونہ ملتا ہے کہ وہ نصوص سے کیسے استدلال کرتا اور کیسے ترجیح قائم کرتا ہے؛ دوسرے یہ کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فتویٰ محل کے تنگ خانے سے نکل کر دور کے بڑے فکری مباحث کا جواب بھی ہو سکتا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ مجموع فتاویٰ ابن تیمیہ 37 جلدوں پر مشتمل ایک موضوعاتی ترتیب والا عظیم علمی ذخیرہ ہے جس کی وسعت عقائد سے فقہ اور سلوک سے سیاست تک پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا فقہی منہج نصوص کی بالادستی، سلف کی اتباع، دلیل کی بنیاد پر ترجیح اور اختلاف میں وسعت پر قائم ہے۔ یہ مجموعہ اس بات کا عملی ثبوت ہے کہ فتویٰ اگر دلیل و تحقیق کے ساتھ دیا جائے تو وہ صرف ایک سوال کا جواب نہیں رہتا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے بھی علم کا خزانہ بن جاتا ہے۔

سوال نمبر 4: دار الافتاء المصریہ اور یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق: تقابلی جائزہ (20 نمبر)

سوال نمبر 4: دار الافتاء المصریہ اور یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق کی علمی خدمات کا تقابلی جائزہ پیش کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

جدید دور میں افتا کی ادارہ جاتی صورت کے دو نمایاں نمونے دار الافتاء المصریہ اور یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق ہیں۔ پہلا ادارہ مسلم اکثریتی ملک کا سرکاری دار الافتا ہے جس کی تاریخ ایک صدی سے زائد پر محیط ہے، اور دوسری یورپ میں آباد مسلم اقلیت کی اجتماعی افتا کی کونسل ہے جو غیر مسلم معاشروں کے مسائل کا حل پیش کرنے کے لیے قائم

ہوئی۔ دونوں کا مقصد ایک ہے، یعنی اہل و منظم افتا، مگر ان کے سیاق، اسلوب اور چیلنج بہت مختلف ہیں۔ اس جواب میں دونوں اداروں کا تعارف، ان کی علمی خدمات اور پھر ان کا تقابلی جائزہ پیش کیا جائے گا۔

دارالافتاء المصریہ: قیام و ساخت

دارالافتاء المصریہ کا قیام 1895ء میں مصر میں عمل میں آیا، جب "مفتی الدیار المصریہ" کا سرکاری عہدہ اور اس کا دفتر باقاعدہ ادارے کی شکل اختیار کر گیا۔ اس کے سربراہ مفتیِ جمہوریہ کہلاتے ہیں اور یہ ادارہ آج مصر کے قدیم ترین دینی اداروں میں شمار ہوتا ہے۔ ادارے کی ساخت میں سکرٹریٹ، فتویٰ کمیٹیاں، شرعی تحقیقی شعبے، لائبریری اور تربیتی نظام شامل ہیں۔ افتا کا طریقہ یہ ہے کہ سوالات تحریری، زبانی، ٹیلی فون اور ویب سائٹ کے ذریعے موصول ہوتے ہیں، ان کا اندراج ہوتا ہے، "امناء الفتویٰ" ابتدائی تحقیق کرتے ہیں اور پیچیدہ یا نئے مسائل اجتماعی شعبوں میں غور کے بعد فیصلہ پاتے ہیں۔ مصر کی عدالتی روایت میں سزائے موت جیسے حساس مقدمات میں بھی عدالت اس ادارے کی شرعی رائے طلب کرتی ہے، جو اس کے قانونی مقام کا اظہار ہے۔ شیخ محمد عبدہ جیسے ممتاز مفتی بھی اس منصب پر فائز رہے ہیں، جس سے ادارے کی اصلاحی روایت کا بھی پتہ چلتا ہے۔

دارالافتاء المصریہ کی علمی خدمات

اس ادارے کی علمی خدمات کئی جہتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اولاً فتاویٰ کا ریکارڈ: اس کے پاس ایک صدی سے زائد عرصے کے لاکھوں فتاویٰ کا محفوظ ذخیرہ موجود ہے جو معاصر مصری معاشرے کی دینی و سماجی تاریخ کا قیمتی ماخذ ہے۔ ثانیاً مطبوعات و تحقیق: ادارہ مجلہ، کتب اور تحقیقی مقالات شائع کرتا ہے اور جدید موضوعات مثلاً بینک کاری، طبی اخلاقیات اور ڈیجیٹل معاملات پر تحقیقی کانفرنسیں منعقد کرتا ہے۔ ثالثاً تربیت: دیگر ممالک کے مفتیوں اور طلبہ کے لیے افتا سازی کے تربیتی پروگرام چلاتا ہے، اس مقصد کے لیے اس نے مستقبل کے مفتیوں کی تیاری کے باقاعدہ کورسز قائم کیے ہیں۔ رابعاً بین الاقوامی کردار: مصر کی وزارتِ خارجہ اور الازہر کے ساتھ مل کر یہ ادارہ عالم اسلام میں اعتدال پسند دینی بیانیے کی ترویج اور انتہا پسندی کے فتاویٰ کے رد میں کردار ادا کرتا ہے؛ اس مقصد کے لیے "الامانۃ العامۃ لدور و ہیئات الافتاء فی العالم" یعنی دنیا بھر کے دار

الافتاؤں کی رابطہ تنظیم بھی اسی کے زیر اہتمام قائم ہوئی۔ خامساً ڈیجیٹل افتا: اس کی ویب سائٹ متعدد زبانوں میں آن لائن استفتا کی سہولت دیتی ہے اور عوامی آگاہی کے لیے مستقل مہمات بھی چلائی جاتی ہیں۔

یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق: قیام و مقاصد

یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق (المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث) کا قیام 1997ء میں عمل میں آیا؛ اس کا تاسیسی اجلاس لندن میں ہوا اور اس کا صدر دفتر ڈبلن (آئرلینڈ) میں رکھا گیا۔ کونسل کی قیادت ابتداء ہی سے شیخ ڈاکٹر یوسف القرضاوی (رح) کے ساتھ رہی اور اس میں یورپ و مغرب میں آباد مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والے علما و محققین شامل ہیں۔ قیام کا محرک یہ حقیقت تھی کہ یورپ میں کروڑوں مسلمان مستقل شہری بن چکے تھے اور ان کے سامنے عبادات سے لے کر خاندان، خوراک، بنک کاری، شرکت و شہریت تک کے وہ مسائل تھے جن کا روایتی کتابوں میں براہ راست جواب موجود نہیں تھا، اور مقامی سطح پر علم کی کمی کی وجہ سے انتشار پھیلنے کا خدشہ تھا۔ کونسل کا بنیادی تصور "فقہ الاقلیات المسلمۃ" یعنی مسلم اقلیتوں کی فقہ ہے، جس کی نظریاتی بنیاد یہ ہے کہ شریعت کے احکام کا اطلاق زمان و مکان اور احوال کی رعایت کے ساتھ ہونا چاہیے۔

یورپین کونسل کی علمی خدمات

کونسل کی خدمات میں سرفہرست اس کے سالانہ اجتماعات ہیں جن میں ارکان کسی موضوع پر پیشگی تحقیق پیش کرتے ہیں، باہمی مناقشے کے بعد "قرارات و فتاویٰ" اکثریتی اتفاق سے جاری کیے جاتے ہیں۔ یہ قرارات باقاعدہ کتابی صورت میں متعدد جلدوں میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا دنیا کی بڑی زبانوں میں ترجمہ بھی ہوا ہے۔ کونسل کا سہ ماہی علمی جریدہ بھی تحقیقی مقالات شائع کرتا ہے۔ اس کے معروف فتاویٰ و قرارات میں یورپی مسلمان کے لیے سود کے بغیر گھر کی خریداری کی بارے دار ضرورت کی بنیاد پر بحث، نماز و روزے کے اوقات کے انتہائی عرض البلد کے مسائل، ذبیحہ و حلال غذا کے ضوابط، ملازمت و بینکاری کے مسائل اور غیر مسلم معاشرے میں سماجی شرکت کے اصول خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ کونسل نے یہ خدمت بھی انجام دی کہ اقلیت کے مسائل کو انفرادی انتشار سے نکال کر اجتماعی اجتہاد کے دائرے میں لے آئی اور یورپ کے مقامی علما کی

تربیت کا بھی اہتمام کیا۔ البتہ اس کے بعض فتاویٰ پر عالم اسلام کے دیگر حلقوں کی طرف سے تنقید بھی ہوتی رہی ہے، خصوصاً جہاں ضرورت کا دائرہ وسیع کر کے آسانیاں دی گئیں، وہاں ناقدین نے احتیاط کی تلقین کی ہے۔

جدول 1: دونوں اداروں کا تقابلی خلاصہ

یورپین کونسل	دار الافتاء المصریہ	پہلو
1997ء، صدر دفتر ڈبلن	1895ء، قاہرہ	قیام
غیر سرکاری علمی کونسل	ریاستی سرکاری ادارہ، مفتی جمہوریہ	حیثیت
یورپ کی مسلم اقلیتیں	مسلم اکثریتی معاشرہ (مصر و عالم اسلام)	مخاطب
سالانہ اجتماعات، اجتماعی اجتہاد	ادارہ جاتی، امناء الفتویٰ و کمیٹیاں	طریقِ کار
فقہ الاقلیات و مقاصدِ شریعت	مذہبی تراث سے بندھا سرکاری اعتدال	نظریاتی محور
قرارات و فتاویٰ کے مجموعے، اقلیتی مسائل	فتاویٰ کا ریکارڈ، تربیت، ڈیجیٹل افتا	اہم خدمت

تقابلی تجزیہ

دونوں اداروں کا تقابلی مطالعہ تین نکات کو نمایاں کرتا ہے۔ پہلا نکتہ سیاق کا فرق ہے: دار الافتاء اپنے اصل مخاطب کی دینی زندگی کو ریاستی استحکام و قومی اتحاد سے جوڑتا ہے، جبکہ کونسل کا مسئلہ شناخت کا تحفظ اور غیر مسلم قوانین و ثقافت کے اندر رہتے ہوئے دین پر عمل ہے۔ دوسرا نکتہ منہجی ہے: دار الافتاء عام طور پر چار مذاہب کی تراث کے اندر اور شرعی سیاست کے اعتدالی فریم میں کام کرتا ہے، جبکہ کونسل مقاصد و مصالح اور فقہ الموازنات کو زیادہ وسعت سے استعمال کرتی ہے، جس کی وجہ سے اس کے بعض فتوے نسبتاً زیادہ "تیسیر" (آسانی) لیے ہوتے ہیں۔ تیسرا نکتہ ساخت کا ہے: دار الافتاء ریاستی حمایت کی وجہ سے مضبوط انتظامی ساخت، بڑا عملہ اور وسائل رکھتا ہے، مگر اسی حمایت پر سیاسی اثر کے شبہات بھی اٹھتے ہیں؛ کونسل مالی و ادارہ جاتی لحاظ سے کمزور ہے مگر علمی آزادی و نمائندگی میں زیادہ متنوع ہے۔ دونوں کی مشترکہ خوبی اجتماعی افتا کی روایت ہے، جس نے انفرادی فتویٰ کے خطرات کو کم کیا، اور مشترکہ چیلنج ڈیجیٹل دور میں عوام تک صحیح آواز پہنچانا ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ دار الافتاء المصریہ اور یورپین کونسل برائے افتا و تحقیق، اگرچہ اپنے اپنے سیاق میں مختلف نہج پر چل رہے ہیں، مگر دونوں اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ ادارہ جاتی و اجتماعی افتا وقت کی ضرورت ہے۔ ایک نے اکثریتی معاشرے کی دینی قیادت کو سرکاری سطح پر منظم کیا، دوسرے نے اقلیت کی فقہی خود مختاری کو علمی بنیاد دی۔ ان کا مطالعہ طالب علم کو سکھاتا ہے کہ فتویٰ کا نظام ماحول کے فرق کے ساتھ اپنی صورتیں بدلتا ہے، مگر اس کا اصول، یعنی دلیل، احتیاط اور مقاصد کی رعایت، ہر جگہ ایک رہتا ہے۔

سوال نمبر 5: اجتہاد اور تقلید: حدود، شرائط اور اہمیت (20 نمبر)

سوال نمبر 5: اجتہاد اور تقلید کی حدود و شرائط اور اہمیت واضح کیجیے۔ (20 نمبر)

تعارف

اجتہاد و تقلید فقہ اسلامی کے وہ دو اصول ہیں جن پر شریعت اور انسانی زندگی کا رابطہ قائم رہتا ہے۔ اجتہاد نصوص سے نئے مسائل کے احکام نکالنے کی اہلیت و عمل کا نام ہے، اور تقلید اس شخص کا اہلِ علم پر اعتماد کرنا ہے جو خود یہ استنباط نہیں کر سکتا۔ امت کی تاریخ میں یہ دونوں نظام ساتھ ساتھ چلے ہیں: علمی طبقہ اجتہاد کرتا رہا اور عام لوگ ائمہ کی تقلید کرتے رہے؛ اسی توازن نے شریعت کو جامد ہونے سے بھی بچایا اور انتشار سے بھی۔ مگر جب ان دونوں کی حدود و شرائط نظر انداز ہو جائیں تو ایک طرف تقلید جامد مذہبی جمود پیدا کرتی ہے اور دوسری طرف بے قید اجتہاد کے دعوے شریعت کو کھلونا بنا دیتے ہیں۔ اس جواب میں دونوں کا مفہوم، ان کی شرائط و حدود، اور اہمیت کا تجزیہ پیش کیا جائے گا۔

اجتہاد: مفہوم و شرائط

اجتہاد لغت میں کامل کوشش صرف کرنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں فقیہ کا شرعی احکام کو ان کے تفصیلی دلائل سے حاصل کرنے میں اپنی پوری توانائی صرف کرنا ہے۔ یہ عمل رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے مشروع ہے؛ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے وقت آپ ﷺ نے ان کی اس بات کی تصدیق فرمائی کہ کتاب و سنت میں حکم نہ ملے تو وہ اپنی رائے سے اجتہاد کریں گے (ابو داود و ترمذی)۔ اجتہاد کے لیے اصولیین نے شرائط مقرر کی ہیں: قرآن کا علم بشمول ناسخ و منسوخ اور آیاتِ احکام کی معرفت؛ سنت و احادیثِ احکام کا علم، ان کی اسناد و روات کی جانچ کی اہلیت؛ اجماع کے مقامات کی واقفیت تاکہ اجماع کی مخالفت نہ ہو؛ قیاس و اصولِ فقہ پر مکمل عبور؛ عربی زبان میں اس درجے

کی مہارت کہ نصوص کی مراد درست سمجھے؛ مقاصدِ شریعت کی بصیرت؛ اور بحیثیت انسان عدالت و تقویٰ، تاکہ اجتہاد ہوائے نفس کا نام نہ بن جائے۔ یہ شرائط بتاتی ہیں کہ اجتہاد ہر صاحب رائے کے لیے نہیں، بلکہ عمری محنت کی پکی ہوئی اہلیت مانگتا ہے۔

اجتہاد کی حدود و اہمیت

اجتہاد کی حدود بھی شرائط ہی کی طرح واضح ہیں۔ پہلی حد یہ ہے کہ قطعی الثبوت والدلالہ نصوص کے مقابلے میں اجتہاد نہیں ہوتا؛ نماز و روزے کی فرضیت، سود و شراب کی حرمت جیسے قطعی احکام اجتہاد کے دائرے سے باہر ہیں، اصولی قاعدہ ہے: "لا اجتہاد مع النص"۔ دوسری حد یہ کہ قطعی اجماع کے خلاف رائے اجتہاد نہیں کہلائی جاسکتی۔ تیسری حد یہ کہ اجتہاد کا دائرہ ظنی و اجتہادی مسائل ہیں، جہاں نص خاموش ہو، عام ہو، یا اس کے اطلاق کا مسئلہ ہو۔ انہی حدود کے اندر اجتہاد کی اہمیت غیر معمولی ہے: نئے مسائل ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں؛ تجارت کی نئی صورتیں، طب کی جدتیں، ٹیکنالوجی کے سوالات، ان سب کا جواب اجتہاد ہی دیتا ہے۔ اگر اجتہاد کا عمل رک جائے تو شریعت کی ہمہ گیری کا دعویٰ عملاً ختم ہو جائے اور مسلمان زندگی کے اہم شعبے شریعت کی رہنمائی سے محروم رہ جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر زمانے میں ہر دور میں کسی قابل مجتہد کا وجود امت کے لیے "فرضِ کفایہ" قرار دیا ہے، اور دورِ جدید میں اسی ضرورت نے "اجتہادِ اجتماعی" یعنی اکیڈمیوں کے ذریعے اجتماعی غور و فکر کا نظام پیدا کیا ہے تاکہ نئے مسائل میں انفرادی غلطی کا خطرہ کم ہو۔

تقلید: مفہوم، شرائط و حدود

تقلید لغت میں گلے میں ہار ڈالنے کو کہتے ہیں اور اصطلاح میں کسی مجتہد کے قول کو بغیر اس کی دلیل کا مطالبہ کیے اس اعتماد پر قبول کرنا ہے کہ کہنے والا اہل ہے۔ تقلید کی شرعی بنیاد قرآن کی یہ آیات ہیں: "فسئلوا اہل الذکر ان کنتم لا تعلمون" (النحل: 43)؛ ظاہر ہے جو شخص دلیل سے استنباط نہیں جانتا اس کے لیے عمل کا راستہ یہی ہے کہ اہلِ علم سے پوچھ کر چلے۔ تقلید کی شرائط و حدود یہ ہیں: (1) تقلید صرف اس شخص کے لیے ہے جو اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو؛ مجتہد کے لیے اپنے اجتہاد کے مقابل دوسرے کی تقلید جائز نہیں۔ (2) تقلید کسی معتبر مجتہد و مذہب کی ہو؛ ہر کہنے والے کے پیچھے چلنا تقلید نہیں، اتباعِ ہوا ہے۔ (3) مقلد کے لیے یہ مناسب سمجھا گیا ہے کہ وہ عموماً ایک ہی مذہب کی پابندی کرے تاکہ اس کا دینی نظام منتشر نہ ہو؛ البتہ ضرورت کے وقت دوسرے مجتہد کے قول پر عمل کی بحث علما کے ہاں تفصیل سے موجود ہے۔ (4) تقلید کا دائرہ اجتہادی و

فروعی مسائل ہے؛عقائد کی بنیادیات اور قطعیات میں اندھی تقلید نہیں ہوتی، وہاں دلیل ویقین کی بات ہوتی ہے۔(5) تقلید کا ہرگز یہ معنی نہیں کہ نص صریح کے مقابلے میں کسی کا قول برقرار رکھا جائے؛ائمہ خود فرماتے گئے کہ صحیح حدیث ملے تو وہی ہمارا مذہب ہے۔

تقلید کی اہمیت اور اس پر اعتراضات کا جائزہ

تقلید کی اہمیت عملی زندگی سے سمجھ آتی ہے۔ جس طرح مریض ڈاکٹر پر اعتماد کرتا ہے اور موکل وکیل پر، اسی طرح دینی مسائل میں عام آدمی عالم پر اعتماد کرتا ہے؛ ہر شخص سے یہ توقع رکھنا کہ وہ خود قرآن وسنت سے احکام نکالے گا، علم کی فطرت ہی کے خلاف ہے اور عملاً گمراہی کا دروازہ ہے، کیونکہ کم فہم لوگ نصوص کے بعض وظاہر پر عمل کر کے وہ نتائج نکالتے ہیں جن سے بڑے بڑے فتنے پیدا ہوتے ہیں۔ تقلید نے امت کو ایک اور بڑا فائدہ دیا: دینی عمل میں استقرار وتسلسل؛ خاندان، مسجد اور معاشرہ ایک منظم فقہی نظام سے جڑے رہے اور ہر نئے "محقق" کے پیچھے معاشرہ نہیں بدلا۔ البتہ تقلید پر دو اعتراضات بھی مشہور ہیں: ایک یہ کہ جامد تقلید نے اجتہاد کا دروازہ بند کر کے جمود پیدا کیا؛اس کا جواب یہ ہے کہ قصور تقلید کے اصول کا نہیں، اس کے مفرط استعمال کا ہے، وگرنہ مذہب کی پابندی کے ادوار میں بھی اہلِ تحقیق وترجیح کا عمل جاری رہا۔ دوسرا اعتراض یہ کہ تقلید کتاب وسنت کی اتباع کے منافی ہے؛جواب یہ کہ مقلد درحقیقت عالم کے واسطے سے کتاب وسنت ہی کی اتباع کر رہا ہے، جیسے قرآن نے خود اس واسطے کو مقرر کیا ہے۔ رہی تقلید مذموم، وہ کسی انسان کے قول کو نص کے اوپر رکھنا اور تعصب میں دلیل کو رد کرنا ہے، جس کی مذمت ائمہ خود کرتے رہے ہیں۔

اجتہاد و تقلید کا باہمی تعلق وتوازن

حقیقت یہ ہے کہ اجتہاد و تقلید باہم متضاد نہیں بلکہ ایک ہی نظام کے دو دائرے ہیں۔ تقلید اجتہاد ہی کی پیداوار پر چلتی ہے: ائمہ نے اجتہاد کیا، قوم نے اس اجتہاد کو اعتماد سے لے لیا۔ اگر اجتہاد رک جائے تو تقلید جامد ہو جاتی ہے، اور اگر تقلید ختم ہو جائے تو ہر شخص کا "اجتہاد" انتشار بن جاتا ہے؛امت کی تاریخ میں جب ان میں سے ایک پہلو کمزور ہوا تو نقصان دوسرے کی صورت میں نکلا۔ جدید بحث میں اس توازن کی عملی صورت اجتماعی اجتہاد کے ادارے ہیں: اہلِ اہلیت مل کر نئے مسائل کا فیصلہ کرتے ہیں اور عام مسلمان اس فیصلے پر اعتماد کر کے چلتے ہیں، گویا تقلید علمی ادارے کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ مفتی کے لیے بھی یہی اصول ہے: جس حد تک وہ مقلد ہے اس حد تک اپنے مذہب

کے معتمد قول کی پابندی کرے، اور جہاں نص کی عدم موجودگی میں اجتہاد فی المذہب یا ترجیح کی گنجائش ہو وہاں اہلیت و احتیاط کے ساتھ کام لے، مگر قطعیات سے آگے بڑھنے کا دعویٰ کبھی نہ کرے۔

نتیجہ

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اجتہاد شریعت کی وسعت و بقا کی ضمانت ہے، مگر یہ قطعی نصوص و اجماع کی حدود اور سخت علمی شرائط کا پابند ہے؛ اور تقلید عام امت کے لیے دینی استقرار کی بنیاد ہے، مگر اس کا دائرہ فروعی مسائل تک ہے اور اس کی شرط یہ ہے کہ وہ غیر مجتہد کی ہو اور نصِ صریح کے مقابل کھڑی نہ کی جائے۔ امت کی علمی تاریخ کی کامیابی اسی توازن میں رہی ہے: علما اجتہاد کرتے رہے، نظام ان اجتہادات کو مکاتب میں محفوظ کرتا رہا اور عوام اعتماد کے ساتھ اس پر عمل کرتے رہے۔ موجودہ دور کا تقاضا یہ ہے کہ اجتہاد کے لیے افراد کے بجائے اجتماعی اداروں کو مضبوط کیا جائے اور تقلید کو تعصب و جمود سے پاک رکھا جائے، تبھی یہ نظام اپنی اصل روح کے ساتھ قائم رہ سکتا ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com